عاصمہ اصغر

پی ایچ۔ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

شام کی منڈیر سے: ایک نفسیاتی تجزیہ

Asma Asghar

PhD Scholar, Department of Urdu, University of Education

Lower Mall Campus, Lahore

Sham Ki Mundare Se: A Psychologicl aspect

Dr. Wazir Agha will survive in the history of Urdu literature for ever. He is matchless in deriving novel ideas in the light of modern science to contribute in the field of criticism. His autobiography "Sham Ki Mundare Se" is a great source to understand his personality and ideas. This work brings to light such aspects of his personality which cannot be witnessed with any other reference.

Therefore, in the context of this autobiography the psychological aspects of his personality have been identified.

ڈاکٹر وزیر آغا (۱۹۲۲ء۔۲۰۱۰ء) کا شمار اُردو ادب کی اُن نا قابلِ فراموش ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ وہ اُردو زبان کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے جدید نظریات کی روشنی میں ادب کی تفہیم و تحسین کے نئے دَر وا کیے اور خالص سائنس کے مطالعے کا رُخ پھیر کر اسے ادب کی قلمرو میں داخل کیا اور نئے زاویوں سے تنقید ادب کا فریضہ انجام دیا۔ اُن کی تخلیقاتِ شعر و نثر کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے اُن کی شخصیت کا ادراک بہت ضروری ہے۔ جس کا ایک نہایت اہم حوالہ اُن کی آپ بیتی ''شام کی منڈیر سے'' ہے۔ اس آپ بیتی میں انھوں نے نہ صرف اپنی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں بلکہ اپنی تخلیقی زندگی کے اُن سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے جو ان کی تخلیقات میں ایک قوتِ محرکہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ آپ بیتی دسمبر ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ آپ بیتی ۲۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے عنوانات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے آغاز ہونے والے سفر کو انھوں نے مرحلہ وار طے کرتے ہوئے جنوری ۱۹۸۱ء کو اختتام تک پہنچایا ہے۔ گویا اپنی زندگی کے ساٹھ برس کی داستان انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کر دی ہے۔ اِس سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک طویل نظم کی کتاب ''آدھی صدی کے بعد'' شائع ہوئی تھی جس کے بارے میں وہ ''شام کی منڈیر سے'' میں لکھتے ہیں کہ:

''آج سے چند سال پہلے جب مجھے ''آدھی صدی کے بعد'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھنے کی سعادت نصیب

ہوئی تو میں خوش تھا کہ میں نے اپنی کہانی سنادی ہے اور اب میں مکمل طور پر آزاد ہوں۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے ''آدھی صدی کے بعد'' میں تو صرف اپنے محسوسات کے مدوجزر کی داستان ہی قلم بند کی ہے اس کے عقب میں پھیلے ہوئے ان واقعات اور حادثات کی نشان دہی نہیں کی جن کے بالواسطہ یا بلا واسطہ اثرات سے یہ کہانی مرتب ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں میں نے اس میں اپنے فکری جزر ومد کے حامل سفر کو بھی موضوع نہیں بنایا۔ لہٰذا مجھے اپنی کہانی ایک بار پھر سنانی چاہیے۔''(۱)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس خودنوشت کو یادوں کی باز آفرینی بھی کہا ہے اس آپ بیتی کا بنیادی وصف اس کی زبان نہیں بلکہ Thought Content ہے۔ تاہم موضوع کے حوالے سے اس آپ بیتی کے وہ حصے اہمیت رکھتے ہیں۔ جن میں مصنف کی ذات اور شخصیت نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا بچپن اُن کے گاؤں ''وزیر کوٹ'' میں گزرا اور اس جگہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے مراحل بھی طے کیے۔ سکول کے دور کے ایک واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نہایت مؤدب، کم گو اور شرمیلا تھا۔ اس قدر کہ سکول کی سالانہ تقریب انعامات میں مجھے خاموشی کا انعام ملا۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت بُرا ہوا کیونکہ خاموش رہنے کا انعام پا کر میں نے سوچا کہ یہ کوئی بڑا وصف ہے چنانچہ میں مزید خاموش ہو گیا اور میری فطری جھجک مجھے خاموش پا کر مزید دلیر ہو گئی۔''(۲)

میٹرک کے امتحانات کے بعد کا عرصہ بھی انھوں نے وزیر کوٹ میں بسر کیا بوریت سے بچنے کے لیے شکار کے شوق کو اپنایا۔ اپنے پہلے شکار کے واقعہ کو انھوں نے یوں قلم بند کیا ہے کہ:

''بندوق کی نالی ایک درخت کی شاخ پر پوری طرح جما کر اور کھیت میں بیٹھی ہوئی فاختہ کو نشانہ بنا کر بندوق کی لبلبی دبا دی، بالکل معمولی سا جھٹکا لگا مگر دوسری طرف فاختہ بے چاری زمین پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ بیک وقت میرے سینے میں کئی طرح کے جذبات کروٹیں بدلنے لگے ایک تو خوشی تھی کہ میں نے وہ کام کیا جو صرف بڑے کر سکتے تھے دوسرے یہ دُکھ کہ میں نے کسی کی جان لے لی تھی۔ ایک لمحہ پہلے فاختہ تمام تفکرات سے آزاد کھیت میں ٹہل ٹہل کر دانہ دنکا چُگ رہی تھی دوسرے لمحے وہ محض ایک مشتِ پَر تھی۔ مگر ندامت کے احساس پر جذبہ افتخار جلد ہی غالب آ گیا اور میں ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں فاختہ کی لاش اٹھائے گاؤں بھر سے ''حسن کارکردگی'' کی داد سمیٹتا پھرا۔ بڑے بھائی صاحب نے خاص طور پر بہت شاباش دی مگر میری ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں کہنے لگیں یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''(۳)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے والد صاحب بہت متاثر رہے ہیں۔ وہ صاحب علم آدمی تھے اور ہمہ وقت مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ مصنف ان کے شوق مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انھوں (والد صاحب و۔ ع۔ خ) نے ہمیں بتایا کہ پچیس تیس سال تک انھوں نے تصوف اور ویدانت کا مطالعہ کیا تھا اور ہندوستان بھر میں صوفیوں، یوگیوں اور ویدانتیوں کی تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ مطالعہ کا انداز یہ تھا کہ

ساری ساری رات دیے کی روشنی میں کتاب پڑھتے رہتے صبح کی اذان کی آواز بلند ہوتی تو انھیں پتہ چلتا کہ رات بیت گئی۔ مطالعہ کے اس انداز نے پچاس کی عمر تک ان کا ساتھ دیا۔'' (۴)

وزیر آغا نے وزیر کوٹ سے وابستہ یادوں کو بار بار دہرایا ہے اور قاری کو بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ اس گاؤں میں ان واقعات کے وقت موجود تھا۔ وزیر آغا اپنے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ اپنی شادی کے واقعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''دراصل گھر میں واحد ایم۔اے پاس ہونے کے باعث میری قیمت بہت زیادہ تھی۔ سب چاہتے تھے کہ میں کسی امیر کبیر گھرانے میں شادی کروں اور میرے لیے بھاری جہیز کے حصول کے علاوہ زندگی میں دنیاوی طور پر آگے بڑھنے کے امکانات روشن ہو جائیں۔ مگر دوسری طرف میں دولت اور شہرت اور دنیاوی ترقی کو پرِ کاہ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ میرے نزدیک میرے سسرال والوں کی غربت کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جسے ہدف طنز بنایا جاتا بلکہ میں نے تو اس بات ہی کو ان کی سب سے بڑی خوبی قرار دے دیا تھا۔ بہر حال شادی ہوگئی پہلی ملاقات پر میں نے اپنی بیوی کو ایک خوبصورت بیاض بطور اولین تحفہ دی۔ اس بیاض میں میری بہت سی رومانی نظمیں تھیں اس سے بہتر تحفہ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بعد کی زندگی میں مجھے کبھی کہیں نہ کہیں یہ بیاض دکھائی دیتی رہی پھر گم ہوگئی۔'' (۵)

وزیر آغا نے اس خودنوشت میں گاؤں میں گزرے ہوئے لمحات اور وہاں کے ماحول کو مکمل طور پر قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد گھر میں چیزوں کی ترتیب بنی۔ اس سے پہلے گھر کباڑ خانہ لگتا تھا جس میں کوئی چیز بھی ثابت و سالم نہیں تھی۔ والدہ کو گھر کی صفائی دھلائی کا مطلق شوق نہیں تھا اور یہی حال گھر کی دوسری مستورات کا بھی تھا:

''بس میرے والد کا کمرہ صاف شفاف ہوتا کہ انھیں گندگی سے چڑ تھی میری والدہ کی خوشی صفائی دھلائی میں نہیں تھی وہ تو اس بات پر خوش ہوتیں کہ ان کے بچے اور پھر بچوں کے بچے ان کے گرد آ بیٹھیں اور وہ اپنی اس مملکت خداداد، کونشو دنما پاتے دیکھ سکیں میری بیوی لاہور ایسے بڑے شہر سے آئی تھی یہ تو خیر کوئی وصف خاص نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک نیا کلچر لے کر آئی تھی لاہور میں میرے سسرال والوں کا گھر غربت میں شرابور تو تھا مگر انتہائی صاف شفاف اور بِک سَک سے درست تھا۔ افراد خانہ بھی صفائی کے دلدادہ تھے میری بیوی جب گاؤں میں آئی تو اپنے ساتھ صفائی کا جّن بھی لائی۔'' (۶)

گورنر کی صوبائی مشاورتی کونسل کا ممبر نامزد ہونے کے باعث وزیر آغا ایک بڑے حدود میں گھومنے لگے مگر ان کے لیے سیاست کی دنیا نامانوس اور اجنبی تھی اسمبلی ہال میں ''اجنبی'' کے موضوع پر کوئی نظم یا انشائیہ تحریر کرنا چاہا مگر بقول وزیر آغا وہ فرمائشی پروگرام کے عادی نہیں خواہ فرمائش اپنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''چند ہی ہفتوں کے اندر اندر مجھے صوبے کی بہت سی اہم کمیٹیوں کا ممبر بنا دیا گیا اور میری عزت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اس وقت مجھے بہت سے دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں اگر گورنر صاحب کے مزید قریب ہو جاؤں تو میرا سیاسی مستقبل محفوظ ہو جائے گا مگر دوسری طرف میرا سانس رکنے لگا تھا۔ تصنّع اور دنیاداری کی فضا اور جوڑ توڑ اور

سیاسی مراعات حاصل کرنے کی دوڑ میرے لیے نا قابل برداشت تھی میں جلد از جلد اس ساری فضا سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب صوبائی مشاورتی کونسل کا عرصہ حیات ختم ہوا تو میں چپکے سے واپس سرگودھا آ گیا اور پھر کبھی اس سڑک پر نہ گیا جو سیاست کے رُومتہ الکبریٰ کی طرف جاتی ہے۔''(۷)

ڈاکٹر وزیر آغا کا ڈاکٹریٹ کا تھیسس ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''۱۹۵۸ء میں میرا ڈاکٹریٹ کا تھیسس اردو ادب میں طنز و مزاح کے نام سے شائع کر دیا گیا اور یہ شائع ہوتے ہی بیسٹ سیلر (Best Seller) قرار پایا۔ بیسٹ سیلر اس اعتبار سے کہ ایک ہی سال کے اندر اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ کتاب کے جلد فروخت ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو طنز و مزاح کے بارے میں مواد جمع کرنے اور آرا مرتب کرنے میں بڑی دقت کا سامنا تھا چنانچہ یہ کتاب اس وقت بھی اور بعد ازاں بھی ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ نے خوب استعمال کی اس کے نوٹ بنائے اور طلبا تک اس کے مندرجات پہنچائے تاہم جہاں تک مجھے علم ہے پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی نے اس کتاب کو سفارش کروا کے کتب کی فہرست میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد نقوش کا طنز و مزاح نمبر شائع ہوا مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں اردو ادب میں طنز و مزاح سے خوب مدد لی گئی ہے۔''(۸)

وزیر آغا نے اقبال اکادمی کی فرمائش پر کتاب ''تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں'' تحریر کی۔ انھوں نے یہ کتاب تین ماہ کی مختصر مدت میں مکمل کر لی۔ اور اس سلسلے میں بڑے فخریہ انداز میں اس خط کا حوالہ آپ بیتی میں درج کرتے ہیں جو انھوں نے کتاب مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر انور سدید کو لکھا:

''انور صاحب! میں نے یہ کتاب پورے تین ماہ میں مکمل کر لی ہے یعنی اسے ۵/اگست کو لکھنا شروع کیا اور ۵/نومبر کو مکمل کر لی۔ اس عرصہ میں مجھے نہیں معلوم کہ کب سورج نکلا اور کب غروب ہوا۔ کب میں سویا اور کب میں نے کھانا کھایا بس ایک خواب کی سی کیفیت تھی سوتے جاگتے کا سا عالم! اس سے پہلے میں اردو شاعری کا مزاج اور تخلیقی عمل لکھتے ہوئے بھی شدید ارتکاز کی زد میں آیا تھا۔ مگر ان دونوں کتابوں کا عرصہ تخلیق سال ہا سال پر پھیلا ہوا تھا۔ ''اردو شاعری کا مزاج'' تقریباً پانچ برس میں مکمل ہوئی اور تخلیقی عمل نے بھی چار پانچ سال لے لیے لہٰذا ان کتابوں کو لکھتے ہوئے ارتکاز کی ڈور وقفے وقفے سے ٹوٹ سی جاتی تھی اور میں سکھ کے کچھ سانس لے سکتا تھا۔ مگر تصورات عشق و خرد صرف تین ماہ میں مکمل ہوئی اور یہ تین ماہ کا عرصہ ایک تنی ہوئی رسی پر چلنے میں صرف ہوا۔''(۹)

وزیر آغا اپنے گاؤں کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے آپ بیتی میں اپنی ان کوششوں کو بھی گنوایا ہے جو انھوں نے سرانجام دیں۔ انھوں نے گاؤں والوں کو تعلیم کی خوبیوں کا احساس دلایا اور بچوں کو سکول داخل کرنے کے لیے ان کے والدین کو رضامند کیا اور سکول کے ماحول کو بہتر کو بنانے کی بھی سعی کی:

''میں نے سکول کو ایک تفریح گاہ کی صورت دینے کا ارادہ کیا تا کہ بچے از خود اس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ بچوں

کے کھیلنے کے لیے ایک پارک بنایا، پھولوں کی کیاریاں لگوائیں، نئی چٹائیاں، بلیک بورڈ، گھنٹی اور کرسیاں مہیا کیں، کھیل کا سامان لا کر دیا وغیرہ مگر اس سب کے باوجود سکول میں بچوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ میں نے یہ پیش کش بھی کی کہ جو لڑکا مڈل ہائی سکول یا کالج تک پہنچے گا میں اس کی فیس خود ادا کروں گا اس رعایت کا بھی صرف چند لڑکوں ہی نے فائدہ اٹھایا۔'' (۱۰)

اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے اردو افسانہ سیمینار کے سلسلے میں وزیر آغا دہلی گئے جس میں ان کو اس ڈیلی گیشن کا سربراہ بھی بنایا گیا۔ لکھتے ہیں:

''میرے علاوہ انتظار حسین اور احمد ہمیش کو بھی بلایا گیا۔ تینوں دعوت نامے اکادمی ادبیات پاکستان کی وساطت سے ہمیں ملے تھے۔ اکادمی نے ہی ہمارے سفر کا انتظام کیا اکادمی کے سربراہ مسیح الدین صدیقی صاحب تو اس قدر خوش تھے کہ ہمیں الوداع کہنے لاہور ائیر پورٹ پر بھی تشریف لے آئے تھے وہاں مجھے بتایا گیا کہ یہ ایک ڈیلی گیشن ہے جس کا سربراہ میں ہوں میرا خیال ہے کہ سربراہی کا اعزاز مجھے سینئر ادیب ہونے کی بنا پر عطا ہوا تھا احمد ہمیش تو خیر مجھ سے ویسے ہی دس برس چھوٹے ہیں لیکن یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا کہ وزیر آغا اور انتظار حسین میں سے کون سینئر ہے میرا خیال ہے کہ آخری فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے یقیناً نہ ہوا ہوگا بلکہ ہماری تاریخ پیدائش کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی صدیقی صاحب اپنے تاریخی فیصلہ پر پہنچے ہوں گے چونکہ میں عمر میں انتظار حسین سے چند ماہ بڑا ہوں اور اس اعتبار سے وہ میرے عزیز ہیں لہٰذا مجھے ڈیلی گیشن کی سربراہی سونپ دی گئی۔'' (۱۱)

ہر ادیب ایک عرصہ تک ادب کی دنیا میں راج کرتا ہے مگر کیا کوئی ادیب خود کو اس قابل سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔ ایسے ادیب بہت کم ہیں جن کا صدیوں بعد یا چند برسوں بعد بھی ذکر ہوگا۔ وزیر آغا اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ادب کے حوالے سے دیکھوں تو میرا نام اور کام بیسویں صدی کی چند دہائیوں تک محدود ہے پوری صدی کے تناظر میں میری حیثیت بالکل معمولی ہے جو اس صدیوں کے تناظر میں بالکل معدوم ہو جائے گی بات مجھ ہی تک محدود نہیں، موہوم ہو جانا انسان کا نوشتہ تقدیر ہے۔'' (۱۲)

ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی سے جستہ جستہ اقتباسات کی روشنی میں ایک ایسی شخصیت کا پیکر نگاہوں میں آتا ہے جس نے ایک متوسط طبقے میں آنکھ کھولی۔ اپنی والدہ کے علم سے فیضان حاصل کیا اور اپنے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے فرد قرار پائے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے زمین کے ساتھ بہت گہرا رشتہ استوار کیا۔ جس کا ذکر آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بچپن میں شرمیلے پن کے باعث اکثر خاموش رہنا۔ شکار کا شوق، فاختہ کے شکار پر ایک ہلکے سے درد کے احساس کا دَر آنا مگر جذبہ افتخار کا غالب آ جانا اور اپنی اس حسن کارکردگی کی داد پا کر خوش ہونا، دولت اور شہرت کو پرِ کاہ سے زیادہ اہمیت نہ دینا اور سسرال والوں کی غربت کو ان کی خوبی قرار دینا، شادی کے بعد بیوی کے سلیقے کی تعریف کرنا جس نے گھر کے کباڑ خانے کو اپنے حسن ترتیب سے خوبصورتی میں بدل دیا۔ گورنر کی صوبائی مشاورتی کونسل کا ممبر نامزد ہونے پر صوبے کی اہم کمیٹیوں کا ممبر بننا۔ دوستوں کا گورنر کے قریب ہونے کا مشورہ دینا، مگر ان کا سیاسی فضا میں آنے سے انکار کرنا اور

صوبائی مشاورتی کونسل کی مدت ختم ہونے پر اپنے گاؤں پلٹ آنا، اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا بڑے فخر سے ذکر کرنا اور اسے بیسٹ سیلر کہنا، تین ماہ کی مختصر مدت میں ایک کتاب تصنیف کرنا اور پھر فخریہ انداز میں اپنے ایک دوست کے نام خط میں اس کا ذکر کرنا۔ گاؤں کو ترقی دینے کی کوششوں خصوصاً سکول وغیرہ کا ذکر کرنا۔ اردو افسانہ سیمینار کے ڈیلی گیشن کی سربراہی کا حوالہ دینا اور اس نوع کی بہت سی باتیں آپ بیتی کے اوراق پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے متعارف کراتی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مٹی سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ اور یہی تعلق آگے چل کر ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا تعلق ایک متوسط زراعت پیشہ خاندان سے تھا۔ اس لیے ان کی زندگی میں زمین یا دھرتی بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ زمین سے اپنے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''شادی کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ایک لڑکی سے نہیں بلکہ اس کرّۂ ارض، اس سرسبز و شاداب دھرتی سے شادی رچائی ہے۔ میں زراعت کو بطور پیشہ اختیار کر چکا تھا مگر اب مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ زمین سے میرا رشتہ کاروباری نوعیت کا ہرگز نہیں بلکہ اصلاً جذباتی نوعیت کا تھا۔'' (۱۳)

زمین کے ساتھ اس جذباتی نوعیت کے رشتے میں انھیں پودوں اور درختوں کے ساتھ بھی ایک خاص طرح کا تعلق بنتا ہوا نظر آتا ہے اور وہ یوں محسوس کرتے ہیں کہ جیسے وہ ان کے ہاتھ کے لمس اور قدموں کی چاپ کو پہچانتے ہیں:

> ''دھرتی کے لیے میرے دل میں محبت کا جو طوفان اٹھا تھا۔ وہ دائرہ در دائرہ پھیل رہا تھا۔ شام کو جب میں سیر کے لیے نہر کنارے نکلتا تو دوسرے دیہات بھی میرے اپنے ہو جاتے، دور تک پھیلے ہوئے کھیت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر سبز رنگ کی ایک چادر سی بن جاتے اور میں اس چادر کو اوڑھ لیتا۔ پھر میں اور دور مغرب کی طرف ''کرانہ'' کی پہاڑیوں اور افق پر جھکے ہوئے بادلوں کو بھی خود میں سمیٹ لیتا۔ آخر آخر میں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں خود دھرتی ہوں اور آسمان کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں۔'' (۱۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کے زمین اور دھرتی کے ساتھ اس جذباتی تعلق کی کئی ایک نفسیاتی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ زمین کے ساتھ یہی جذباتی تعلق آگے چل کر ڈاکٹر وزیر آغا کے ٹھوس تنقیدی نظریات کی بنیاد بنا۔ تہذیب اور کلچر کے بارے میں ان کے منفرد نظریات انھی تصورات سے جنم لیتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وزیر آغا کے یہاں دھرتی اور زمین کا حوالہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ شہر کے ہنگاموں سے دور گاؤں میں رہ کر گزارا ہے جہاں انہوں نے مٹی کے لمس کو بڑے قریب سے محسوس کیا ہے اور فطرت کے مظاہر کے ساتھ ایک گہرا تعلق استوار کیا ہے۔ ان کے نزدیک زمین کی ایک تہذیبی اور ثقافتی اہمیت ہے جس میں ارض وطن کا حوالہ بھی ہے جو ہماری جذباتی وابستگی کا مظہر ہے لیکن اس سے آگے زمین کی کوکھ سے تہذیب اور کلچر جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ زمین کو طبقاتی اور معاشی تناظر میں دیکھنے کے بجائے خالص تخلیقی حوالے سے دیکھتے ہیں اور کلچر کو دھرتی کا اٹوٹ انگ قرار دیتے ہیں کہ اس کی جڑیں دھرتی میں بہت دور تک اتری ہوئی ہیں۔'' (۱۵)

مسعود منور، ڈاکٹر وزیر آغا کے دھرتی کے ساتھ اس رشتے کو ''من و تو'' کے حوالے سے دیکھتے ہیں:

''من وتو کا یہی آئینہ ہے جس میں وزیر آغا نے خود کو دریافت کیا ہے۔ اگر ان تعلقات کو منہا کر دیا جائے یا اس رشتہ و پیوند کو مفروضہ قرار دیا جائے تو مصنف کہیں نظر نہ آئیں۔ اس ''من وتو'' کا ربط ہی ان کے ہاں زندگی ہے جس کے بغیر نہ وہ ہیں اور نہ ہی ان کے ہونے کا مطلب ہے۔ ان کا یہ ہونا کسی فکری رو کا حاصل نہیں بلکہ وہ اس لیے ہیں کہ انہوں نے خود کو 'تو' اور کائنات سے مربوط کیا ہے۔''(۱۶)

یونگ کے نکتہ نظر کے مطابق اگر ہم اس صورتحال کو شخصیت کے وجدانی رجحان کے تابع رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وجدانی رجحان کے حامل افراد کے لیے کسی شے کے ادراک کی کسوٹی نہ تو جذبہ ہوتا ہے اور نہ فکر بلکہ اس شے کا وجدانی ادراک ہوتا ہے۔ مسعود منور کا یہ کہنا کہ ''ان کا ہونا کسی فکری رَو کا حاصل نہیں۔'' ظاہر کرتا ہے کہ خود کو دریافت کرنے کا یہ عمل عقلی دلائل یا فکری غور وخوض کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ایک شاعر کا انکشافِ حقیقت ہے جس تک وہ اپنی وجدانی قوتوں کے ذریعے ایک ہی جست میں پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کے انکشافاتِ حقیقت کو اگر منطقی دلائل کے ذریعے سمجھایا جائے تو وہ اپنی معنویت اور دلکشی کھو دیتے ہیں۔ شاعری کی منطق فکر وعقل سے ماورا ہوتی ہے جس کا وجدانی ادراک ہی ممکن ہوتا ہے۔ وجدانی ادراک، عقل یا فکر کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ذات کے اندر آزادہ روی کا وہ رویہ موجود ہے جو حد بندیوں اور ضابطوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ چنانچہ وہ زندگی کے بارے میں کوئی منضبط فارمولا وضع نہیں کرتے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''فطرت کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی میں ہے، سیدھے خط تو صرف انسان کھینچتا ہے اور بزعم خود سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی بڑا تیر مار لیا..... اس لیے کہ ترتیب ایک خلافِ فطرت عمل ہے۔ تہذیب کی گرینڈ ٹرنک روڈ سماج کی دائرہ در دائرہ تنظیم نقطہ نظر کی سیدھی لکیر..... یہ سب انسان نے اپنی سوچ بچار سے ترتیب دیے ہیں، فطرت سے اخذ نہیں کیے۔''(۱۷)

ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ راز فطرت کے عمیق مشاہدے سے پایا ہے کہ ترتیب ایک خلافِ فطرت عمل ہے۔ لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک طرح کا حسنِ ترتیب موجود ہے جسے ان کی باطنی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ جسے وہ اپنی حسیات سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو کسی دانشورانہ فریب سے تعبیر کرنے کے بجائے اس کے اصل میں دیکھا ہے۔ ان کا ہر تجربہ، انکشاف واختراع کی ایک نئی سمت کی نشان دہی کرتا ہے چنانچہ ''شام کی منڈیر سے'' ان کے تخلیقی سفر کی داستان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر انگیز اور بصیرت افروز تصانیف کا پس منظر اور تخلیقی عمل کی روداد بھی بیان کرتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے آپ بیتی میں اپنے بچپن کی یادوں کو کریدتے ہوئے اپنے شرمیلے پن کا ذکر کیا ہے۔ گزشتہ سطور میں درج کیے گئے ایک اقتباس میں انھوں نے اپنے شرمیلے پن کا ذکر کرتے ہوئے اپنے شرمیلے پن کا سبب اپنی جسمانی کمزوری کو قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگر جسم کمزور ہو تو انسان خود میں سمٹ جاتا ہے۔ اسکول سے خاموشی کا انعام پا کر انھوں نے سوچا کہ شاید ''خاموشی'' کوئی خوبی ہے جس کی وجہ سے انھیں انعام کا مستحق گردانا گیا ہے چنانچہ انھوں نے مزید خاموش رہنا شروع کر دیا اور ان کی فطری جھجک نے انھیں مزید اپنی گرفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا شرمیلا پن، جسمانی کمزوری اور خود میں سمٹنا، یہ تینوں رویے ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ اسی سے ملتا ہوا ان کا ایک اور رویہ اس فطری جھجک کا ہے۔ جو بقول ان کے: ''انھیں خاموش پا کر مزید دلیر ہو گئی۔''

عام طور پر بچوں میں اس قسم کی صورتحال تین وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اول: کسی جسمانی نقص کے باعث۔ دوم: لاڈ پیار کے باعث۔ سوم: نظرانداز کیے جانے کے باعث۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے خود یہ بتا کر ہمارے لیے آسانی پیدا کر دی کہ وہ جسمانی اعتبار سے بہت کمزور تھے جس کے باعث وہ ایک تو شرمیلے پن کا شکار ہو گئے اور دوسرے خود میں سمٹ گئے۔ نامور ماہر نفسیات ایڈلر نے اس صورت حال کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایسے بچے جو ایسے اعضا کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جو یا تو بیمار ہوتے ہیں یا بچپن میں مقابلتاً کمزور ہوتے ہیں، وہ اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ ان کا ذہن اپنے جسم کو ایک بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے، اسی باعث ان بچوں میں ذہنی نشوونما بھی بہت سست پڑ جاتی ہے۔ ان کے ذہن کے لیے یہ بات کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے جسم کو قابو میں رکھ کر اس کا رخ پیش قدمی کی سمت میں کریں۔ انھیں کسی بھی کام کے کرنے کے لیے زیادہ مشقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور وہ شے جو عام بچے آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں، ان کے لیے کارِدارد ہوتی ہے۔ (۱۸)

ایڈلر کے خیال میں ان بچوں کی توجہ اپنی ذات سے ہٹا کر دوسروں کی طرف مرکوز کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اپنی حسیات تک ہی محدود رکھتے ہیں، بعد میں اسی باعث حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں فعال نہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ اس واسطے بھی احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں یا پھر نظرانداز کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جو ان کا رخ بار بار اپنی ذات کی طرف موڑ دیتے ہیں اور ان کے دل سے معاشرے کے لیے کوئی مفید کام کرنے کی خواہش معدوم ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا نے ان کے ساتھ تضحیک آمیز سلوک کیا ہے۔ (۱۹)

شرمیلے پن کے باعث ڈاکٹر وزیر آغا کو ابتدائی زندگی میں یقیناً بہت سی الجھنوں سے واسطہ رہا ہوگا لیکن اسی شرمیلے پن نے ان کا رخ اپنی ذات کی طرف موڑ دیا۔ خود میں سمٹنے اور اندر کی غوّاصی کا نتیجہ تھا کہ انھیں اندر کی کائنات کے وسیلے سے باہر کی کائنات کو سمجھنے اور زندگی کو وسیع تر مفہوم میں جاننے کا وژن ملا۔ ''شام کی منڈیر سے'' اس وژن اور تجربے کی خوبصورت عکس بین ہے جس میں نہ صرف ان کی زندگی کے واقعات و حالات اپنے تمام تر تخلیقی محرکات کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں بلکہ ان کی ساری فکر اور سوچ بھی سمٹ آئی ہے۔ اس آپ بیتی میں ڈاکٹر وزیر آغا کی جو شخصیت مرتب ہوتی ہے وہ ایک ایسے سادہ دل اور جنل شخص کی شخصیت ہے جس کے چہرے پر کوئی ماسک نہیں۔ وہ نمود و ناموری کی عجیب خواہش میں مبتلا انسان نظر نہیں آتے بلکہ ان کے احساس میں ایسی تازہ کار سادگی ہے جس کا تصور مشکل بھی ہے اور غیر معمولی بھی۔ بقول مسعود منور: ''جب آدمی وہی رہے جو وہ ہے تو تغیر لمحہ لمحہ عود کر آتا ہے اور ہر لمحہ ایک نئے عہد کی بشارت بننے لگتا ہے۔ ہر زماں ایک نئی گہرائی کی خبر ملتی ہے۔ ایک نئی باطنی سطح دریافت ہوتی ہے۔ کسی ایک لمحے کے اندر سب کچھ نہیں بنا جا سکتا۔ اس لیے وزیر آغا کے کردار میں اداکاری کا شائبہ تک نہیں ملتا اور یہی ذہانت اور فراست کی ایک غیر معمولی سند ہے۔'' (۲۰) ادب اور شاعری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا جو مقام بنتا ہے وہ الگ بحث ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں خود کو جس انداز میں ایکسپوز کیا ہے اس سے ایک پائیدار اور ٹھوس شخصیت کا امیج ابھرتا ہے جس نے خود کو ہمیشہ سفر میں رکھا ہے۔ اور پامردی اور استقلال سے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا ہے۔ ان کے بارے میں درج ذیل سطور اُن کی شخصیت پر بھرپور تبصرے کا درجہ رکھتی ہیں:

''ڈاکٹر وزیر آغا نے دراصل اپنے آپ کو پہلے تخلیق کیا اور پھر معاشرتی نظام کو، جس میں ان کی رفتار کی دھمک اور ہم

آہنگی کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح فطرت زندگی اور انسان کو جنم دے کر کسی نئے عالم کی بنیاد رکھتی ہے اسی طرح کوئی فنکار دم بہ دم حرکت سے آشنا ہو کر نئے عالم اور نئے آدم کو جنم دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اپنی قوتوں کو نت نئے اجسام کی تخلیق میں استعمال کیا ہے اور اب سائنسی نظام اور نئے ادبی تحرک کی روشنی میں خالق وہی ثابت ہوگا جو بہت بڑا عالم اور عامل ہوگا چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے دونوں حیثیتوں میں اپنے تمام تر علم، سائنس اور نفسیات کو معاشرتی نظام کے ساتھ نئی تخلیق کا ذائقہ بخشا ہے۔ ان کے پاس جو سائنسی علم ہے اسے انھوں نے ترقی دے کر زندگی کو فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔'' (۲۱)

درج بالا سطور ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ادب میں اُن کے مقام و مرتبے کو سمجھنے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ اگرچہ مختلف حوالوں سے ادب میں ان کے مقام کو متنازعہ بنانے کی سعیِ نامسعود کی گئی لیکن انھوں نے غیر ضروری معاملات میں الجھنے کے بجائے اپنی منزل اور ہدف کو نگاہ میں رکھا اور مسلسل سفر جاری رکھا۔ اُن کی شخصیت کا یہ رُخ بھی بہت اہم ہے کہ انھوں نے تقریباً نصف صدی ادب کی خدمت کر کے ایک قابلِ لحاظ مقام حاصل کرنے کے باوجود یہ خوش فہمی نہیں پالی کہ وہ صف اوّل کے ادیبوں میں شامل ہیں بلکہ خود کو ہمیشہ ایک معمولی طالب علم ہی سمجھا۔ اپنے وقیع کام سے مطمئن ہونے کے حوالے سے ایک جگہ انھوں نے کہا ہے کہ:

''میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مطمئن ہونا جبھی ممکن ہوتا اگر میں اردو کے دوسرے ادبا کی طرح مغربی ادبیات اور علوم کا مطالعہ نہ کرتا۔ مگر اِس مطالعہ کے بعد میرے لیے ادیب اور مفکر کہلانا بھی باعثِ ندامت ہے۔'' (۲۲)

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا یہ مثبت پہلو اُن کی سوچ کی پختگی اور صلابت کا پتا دیتا ہے۔ وہ بے جا تفاخر، اَنا پرستی اور نرگسیت کا شکار نہیں ہوئے اور بعض دوسرے لوگوں کی طرح خود کو دوسروں پر فائق دکھانے کے زعم میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس اعتبار سے وہ ایک متوازن اور ہموار شخصیت کے مالک ایک زندہ رہنے والے ادیب تھے۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۲۷

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۳۸

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۵۵

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۸۴

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۱۶۲

۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۱۲۸، ۱۲۹

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۱۳۶

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۲۲۳

۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۲۲۵

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۲۵۴،۲۵۵

۱۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۲۸۳

۱۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۸۸

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۸۹

۱۵۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، چنداور مضامین، لاہور، آئی جے ایف پبلی کیشنز، ۲۰۰۹، ص۴۶

۱۶۔ مسعود منور، عرفانِ نفس کی داستان، مضمون مشمولہ کتاب ''شام کا سورج'' مرتبہ انور سدید، لاہور، مکتبہ فکر وخیال، ۱۹۸۹ء، ص۱۱۷

۱۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۱۱۹۔۱۲۰

۱۸۔ ایڈلر، الفریڈ، مرتبہ شہزاد احمد، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص۱۴۹

۱۹۔ ایڈلر، الفریڈ، مرتبہ شہزاد احمد، ص۱۵۰

۲۰۔ مسعود منوّر، عرفانِ نفس کی داستان، مضمون مشمولہ ''شام کا سورج''، ص۱۲۱

۲۱۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت اور پسِ پس نوشت، لاہور، نیا زمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۱۳۳

۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ایک انٹرویو، افضال ملک، مشمولہ مکالمات، مرتب: ڈاکٹر انور سدید، لاہور، مکتبہ فکر وخیال، ۱۹۹۱ء، ص۸۹